Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"تو سچی بات کدھر سے لایا ہے۔" تیسرے نے کہا۔ "تیری موت آئی ہے؟"

آخر ایک مزدور بولنے والوں کی جانب ہاتھ اُٹھا کر بولا۔ "اوئے چُپ کرو، اِدھر بندہ مر رہا ہے، تُم بڑ بڑ کری جا رہے ہو۔ ملک جی! آپ چارپائی وارپائی کو چھوڑیں۔ ہم متھاج لوگ ہیں، اُسے اُٹھا کر لے جائیں گے۔ بس آپ کے دو لفظ چاہئیں۔"

"کیا لفظ؟" اعجاز نے پُوچھا۔

"کمپوڈر کو ایک پرچی لکھ دو کہ اس غریب کی دوا دارُو کرے۔ آپ کی بات کوئی نہیں ٹالے گا۔"

"کوئی کاغذ واغذ ہے؟" اعجاز نے پُوچھا۔ عورت اس کو انجان سی نظروں سے دیکھنے لگی۔ اعجاز کو یاد آیا کہ وہ قلم اَور کاغذ کا ایک آدھ پرزہ جیب میں رکھا کرتا ہے، مگر وہ کئی لحظے تک اُسی طرح عورت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا رہا، جیسے مسحور ہو چُکا ہو۔ پھر اچانک اُس نے نظر جُدا کر کے جیب ٹٹولی اَور اپنا فاؤنٹین پین اَور سفید کاغذ کا تہہ کیا ہوا صفحہ نکالا۔ ایک آدمی باہر سے بانس کے دو موٹے ڈنڈے لِئے داخل ہوا جو اُس نے ایک دُوسرے کے متوازی، زمین پر رکھ دیئے۔ پھر اُنہوں نے گدڑی سے ایک موٹا کمبل اُٹھایا اَور اُس کے کونے رسّی کی خُوب مضبوط گانٹھوں سے ڈنڈوں کے چاروں سروں کے ساتھ باندھ دیئے۔ جب باندھ چُکے تو سب نے مِل کر ہائے ہائے کرتے ہُوئے زخمی نوجوان کو کمبل پر لٹا دیا۔

"میری پسلیوں کو ہاتھ نہ لگاؤ ظالمو!" وہ بِلک کر بولا۔

"خیر ہے شادے، خیر کا بول مُنہ سے نکال، اللہ رحم کرنے والا ہے۔"

"اللہ ظالموں کو دوزخ نصیب کرے۔" عورت روتی ہُوئی چلّائی۔

چار آدمیوں نے اپنی اپنی چادریں تہہ کر کے اُن کے گدّے بنائے اَور اُنہیں کندھوں پہ رکھ لیا۔ پھر اُنہوں نے جھُک کر بانسوں کے سرے اُٹھائے اَور اس ڈولی نما سواری کو کندھوں پہ لِئے گھروندے سے باہر نِکل گئے۔ اعجاز نے رقعہ عورت کے ہاتھ میں تھمایا اَور دونوں ڈولی کے پیچھے سڑک کی جانب چل پڑے۔ سرفراز اُن کے ساتھ قدم ملا کر چلنے لگا۔

"تیرا آدمی ہے؟" اعجاز نے پُوچھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ہاں!" عورت ہولے سے بولی۔

"یہ لوگ کون تھے؟"

"کیا پوچھتے ہو ملک جی!" عورت خاموش ہو گئی۔

"کوئی تو ہوں گے۔"

"ہمارے مالک تھے۔"

"ملکوں کے آدمی تھے؟"

"اُن کے جمعدار تھے۔ مارنے مروانے کا کام ٹھیکیدار انہی سے کرواتے ہیں۔"

"قِصّہ کیا تھا؟" اعجاز نے پوچھا۔

"قِصّہ کیا ہو گا ملک جی! اپنے بچّے کو دو دِن سکُول بھیجا ہے، بس یہ قصہ تھا۔"

سکُول کا نام سُن کر اعجاز کے دِل کو ایک ہوکا لگا، جِس بات کو وہ دِن بھر سے اپنے اندر دفن کئے ہُوئے تھا، جیسے ایک نعش کو لِئے پھرتا ہو۔ اور جسے وہ اس گھروندے کے اندر وقتی طور پہ فراموش کر چُکا تھا، اب دوبارہ اپنا سارا بوجھ لِئے اُس کے سر پہ آسوار ہُوئی تھی۔

"اس بات پر جھگڑا کیسا؟" اعجاز نے پوچھا۔

"دو ہاتھ ٹبّر سے نِکل جائیں تو ہمارا ٹھیکہ پُورا نہیں ہوتا۔ ٹھیکیدار ایک ہزار نگ روز کے مانگتا ہے، کہتا ہے ہماری پیشگی کی رقم زیادہ ہے۔ سکُول کی ضِد میں نے کی تھی، وزن شادے پر آپڑا۔ میں نے سوچا تھا بچّہ کچُھ پڑھ لکھ جائے، اس پیشگی کی غلامی سے نِکل جائے گا جیسے اللہ کی مرضی۔۔۔"

"تیرا نام کیا ہے؟"

"کنیز!"

"عیسائی لوگ ہو؟"

"مسلم شیخ ہیں ملک جی! اللہ رسُول کے ماننے والے ہیں۔ یہاں ہم دو گھر ہی ایمان والے ہیں۔ باقی سب عیسائی ہیں۔"

اب وہ سڑک پر آچڑھے تھے۔ رات کا اندھیرا پھیلتا جارہا تھا۔ یہاں سے ان کے رستے جُدا ہوتے تھے۔ نورپور کی ڈسپنسری کا رستہ دائیں کو مُڑتا تھا، شجاع آباد بائیں ہاتھ پہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا۔ دائیں کو چار آدمی ڈولی کو اُٹھائے چلے جا رہے تھے۔ اعجاز کچھ دیر تک وہاں رُکا عورت کو سڑک پر اُن کے پیچھے جاتے ہُوئے دیکھتا رہا۔ پھر اونچی آواز میں مخاطب ہو کر بولا، "کل پتا کرنے آؤں گا۔"

عورت نے ایک لمحے کو پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ "اللہ آپ کا بھلا کرے۔" وہ بولی اور چل پڑی۔

اعجاز اور سرفراز ساتھ ساتھ گھر کو جا رہے تھے۔

"لالہ! تُم نے آج حاضری کا رجسٹر کلاس میں کیوں چھوڑ دیا تھا؟" سرفراز نے پُوچھا۔

اعجاز نے بے خیالی سے اُس کی طرف دیکھا۔ "یاد نہیں رہا۔" پھر وہ چپکے سے بولا اور خاموش ہو گیا۔

عُمر رسیدہ کا مطلب تو مُجھے چوتھی جماعت میں ہی سمجھ میں آگیا تھا، سرفراز نے اعجاز کے ساتھ ساتھ چلتے ہُوئے سوچا، اور حویلی شمشیر سنگھ کا بھی پتا تھا کہ مالکوں کی لڑائی کی وجہ سے اُسے تالا لگ چُکا ہے۔ میں تو صرف لالے سے باتیں کرنا چاہتا تھا، کیونکہ میں نے ہیڈ ماسٹر کے چپڑاسی کو آتے ہُوئے دیکھا تھا۔ اُس وقت لالے کی کلاس ہماری کلاس کے سامنے والے کمرے میں تھی۔ لالہ کلاس کو بیچ میں ہی چھوڑ کر چپڑاسی کے پیچھے پیچھے باہر نِکل آیا تھا۔ اُس نے پہلے کبھی ایسا نہ کیا تھا بلکہ اکثر وہ گھنٹی ہونے کے بعد بھی کچھ دیر تک پڑھائی کو جاری رکھا کرتا تھا۔ آج جب وہ کلاس کو چھوڑ کر نِکلا تو سب لڑکے چھُٹی کا شور مچانے کی بجائے خاموشی سے مُنہ اُٹھا کر اُسے باہر جاتے ہُوئے دیکھتے رہے۔ مُجھے اُسی وقت کھٹک گئی تھی کہ کوئی بات ہے جس کی وجہ سے ہیڈ ماسٹر نے اتنی جلدی میں لالے کو بلایا ہے۔ بعد میں لوہاروں کے بچے نے مُجھے بتایا کہ وہ ٹٹی خانے سے پیشاب کر کے واپس آ رہا تھا تو اُس نے لالے کو سلام کیا تھا جس کا جواب لالے نے ایسے دیا تھا جیسے بولتے بولتے اُس کا گلا بند ہو گیا ہو۔ ہماری کلاس کی دُوسری کھڑکی سے سکُول کا گیٹ نظر آتا تھا۔ میں نے لالے کو گیٹ پار کر کے بائیں جانب کو مُڑتے ہُوئے دیکھا اور اُس کی چال کو دیکھ کر میرا دِل سکڑ گیا۔ وہ ماسٹر جس کا سارے سکُول میں ایسا دبدبہ تھا کہ طالب عِلم تو ایک طرف، میاں ذوالفقار صاحب ہاکی پلیئر جو پی ٹی ماسٹر تھے اور چودہ چودہ سال کے لڑکے کو ایک ہاتھ پر سر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے اُوپر اُٹھا لیا کرتے تھے، وہ بھی لالے کے سامنے دم نہ مارتے تھے، وہ آج حاضری کا رجسٹر بھی کلاس میں چھوڑ کر، سر جھکائے سکُول سے نِکل گیا تھا۔ میرا جی چاہا کہ اُسی وَقت لالے کے پیچھے جاؤں مگر چھُٹی ہونے میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا۔ چھُٹی کے بعد میں نہ گراؤنڈ میں کھیلنے کے لِئے رُکا نہ کِسی سے بولا چالا، بھاگتا ہُوا گھر پہنچا۔ لالہ چارپائی پہ لیٹا تھا۔ اُس کے چہرے کو دیکھ کر مجُھے یقین ہو گیا کہ کوئی نہ کوئی بات ہے جِس نے اُسے تردد میں ڈال دیا ہے۔ بی بی چاٹی جتنا بڑا پیٹ لِئے پیڑھی پر بیٹھی تھی۔ مگر اُس نے بطئوں بڑے مزے دار پکائے تھے۔ میں کھانا کھا ہی رہا تھا کہ لالہ چارپائی سے اُٹھ کھڑا ہُوا اَور بولا۔ "ذرا باہر جارہا ہوں۔" مجُھے دِل میں محُسوس ہوا جیسے لالہ کِسی خطرے کے سامنے جارہا ہے۔ میں بھی ضِد کر کے اُس کے ساتھ چل پڑا۔ جُوں جُوں ہم چلتے گئے میرے دِل میں پختہ یقین ہوتا گیا کہ لالے کے ساتھ کوئی واردات گزُری ہے۔ وہ کبھی یُوں گھُومنے کے لِئے گھر سے نہ نِکلا تھا، ہمیشہ کِسی کام سے یا ملنے ملانے کے لئے جایا کرتا تھا۔ آج وہ چُپ چاپ کھیتوں میں اِدھر سے اُدھر پھرتا رہا۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر میں نے باتیں چھیڑنے کے بہانے نکالے جِن کا مطلب کوئی نہ تھا۔ مقصد یہ تھا کہ کِسی طرح لالے کا دھیان بٹاؤں۔ لالہ میری باتوں کا جواب اس لِئے دیتا جارہا تھا کہ اُس کے خیال میں میری دِلچسپی اِن سوالوں میں تھی۔ حالانکہ اِن سوالوں کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ مطلب کوئی نہ تھا، صرف مقصد تھا، لالے کی اس حالت کو بدلنا جو میرا دل بند کئے جاتی تھی۔ ہم ڈُھڈی والے کی سڑک پہ چڑھے تو میں نے باغوں اَور حویلیوں کی باتیں شرُوع کر دیں۔ آخر جَب ہمیں کنواں کھودنے والے نظر آئے تو میں نے کہا، لالہ! چلو چل کے دیکھیں۔ لالے کو خیال تھا کہ میں نے یہ کارروائی پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ اصل میں ایک بار میں کنوئیں کی کُھدائی دیکھ چُکا تھا۔ میں نے چَک اُترتے ہُوئے، ٹوبوں کو ڈبکیاں لگاتے، لوگوں کو خُوشیاں مناتے اَور عَورتوں کو روتے ہُوئے دیکھا تھا۔ پِھر بھی میں اَیسا مگن ہو کر کنوئیں کے کِنارے پہ بَیٹھا چَک کو اترتے ہُوئے دیکھتا رہا جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہوں لیکن میری ایک نظر لالے پہ لگی رہی تھی۔ میرے دِل میں اُمنگ تھی کہ وہ اس خول سے نِکلے جِس میں داخل ہونے کے بعد اُس نے خاموشی سے سر جھکا کر اَور ہاتھ پُشت پہ باندھ کر چلنا شرُوع کر دیا تھا۔ یہ خول کِسی اَور کو نظر نہ آتا تھا مگر مجُھے معلوم تھا کہ اُس کے پیچھے لالے نے اپنا چہرہ چھپا لیا ہے۔ دِن کی روشنی گھٹتی جارہی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لالے کا چہرہ سنولا گیا تھا اَور میرا دِل اُلٹنے لگا تھا۔ اُس وَقت خُدا نے ہماری مدد کی اَور یہ عَورت سڑک پر دہائی دیتی ہوئی ہمیں مِل گئی۔ لالے کے چہرے کا رنگ بدَل گیا، اُس کی نظریں عَورت سے نہ ہٹتی تھیں، جیسے کہ وہ ساری دُنیا اَور دُنیا کے کاموں کے ساتھ صرف اس عَورت کے ذریعے سے جڑا ہوا ہو۔ اُس کے اُوپر سے وہ پردہ جس نے اُسے ڈھانپ کر دُنیا سے الگ کر دیا تھا، اُتر چُکا تھا۔ آخری دم تک، جَب تک عَورت نُور پُور کے رستے پر روانہ نہ ہو گئی، لالے کی جان تنومند رہی۔ میں اَور لالہ کچُھ دیر تک سڑک پہ کھڑے اُسے جاتے ہُوئے دیکھتے رہے تھے۔ میں نے لالے کے چہرے پہ نظر ڈالی تو اِس کی آنکھیں کچُھ مدہم پڑ گئی تھیں۔ عَورت کو جاتے ہُوئے دیکھ کر مجُھے بھی محُسوس ہوا جیسے کِسی دولت کا تحفہ میرے ہاتھ سے نِکلا جاتا ہے۔ مگر اب میرا دِل خُوش ہے۔ آنکھوں کی ذرا سی میل کے سوا لالے کا سارا بدَن سیدھا ہے، سر اُٹھا ہُوا ہے اَور بازُو چال کی رفتار کے ساتھ دونوں جانب ہل رہے ہیں۔

گھر کے دروازے پر چاچے احمد کی بَیل گاڑی کھڑی تھی۔ صحن میں دو تین چارپائیاں بچھی تھیں جِن پہ چاچے کے ٹبّر کے علاوہ گاؤں کے مُتعدّد لوگ بیٹھے تھے۔ زمین پر لالٹین رکھی تھی۔ چارپائیوں کے درمیان حُقّہ چل رہا تھا۔

"اجاز!" چاچا احمد اُنہیں دیکھتے ہی بولا۔ "تو کہاں سیر سپاٹا کر رہا ہے؟"

"ذرا پھرنے گئے تھے۔" اعجاز نے جواب دیا۔ "خیر تو ہے؟"

"تیرے اُوپر بات ختم ہوتی تو خیر کہاں کی اَور نخیر کہاں کی؟"

"کیا بات ہے چاچا؟"

"تجھے پتا نہیں کیا بات ہے؟"

رحمت چوہان بول اُٹھا۔ "تیرے ٹبّر کا وَقت پُورا ہو گیا ہے، اجاز! خیر ہے۔"

آنے کی چکی والا سیف اللہ بولا۔ "خیر ہی خیر ہے، دائی آگئی ہے۔ چوہدری احمد تو بات کا بتنگڑ بنا رہا ہے۔"

"بتنگڑ خواہ مخواہ؟" چاچا احمد اُسی مزاج سے بولا۔ "اکیلی لڑکی نے اُٹھ کر دُہائی دی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تو پھر کوئی آیا۔ اس میں ہمّت نہ ہوتی تو پھر؟"

"واہ، چوہدری!" ایک کِسان بولا۔ "اپنی عَورتیں کھیت میں بچّہ جَن کر کماد کی چھلائی کرنے لگتی ہیں۔"

"اس کی ماں نے سو دفعہ کہا چل۔" چاچا احمد بولا۔ "تیرا وَقت سخت ہے، اپنے گھر چلی چل، وَقت ٹل گیا تو آجانا مگر لڑکی کی ایک ہی ضِد کہ ---"

"اس کا گھر یہ ہے۔" سیف اللہ نے زور سے پیر زمین پر مار کر کہا۔ "یہ، چل اب چُپ کر، بے فضُول باتیں کرے جاتا ہے۔ ہم کوئی بے وسیلہ لوگ ہیں؟ اللہ سے خیر کی دُعا مانگ، خُوشی کا مَوکہ ہے۔"

سیف اللہ کا سخت لہجہ سُن کر چاچا خاموشی سے حُقّہ گُڑ گُڑانے لگا۔

چلو بھئی، روٹی آگئی۔" سیف اللہ نے کہا۔ "ذرا ہٹ کے بیٹھ جاؤ۔ جگہ دو، بسم اللہ کرو۔"

سیف اللہ کے گھر سے سونف والے گُڑ کے میٹھے چاولوں کی پراتیں اَور دُودھ کے کٹورے آگئے۔ تینوں چارپائیوں پر لوگ اِدھر اُدھر ہو کر بیٹھ گئے اَور درمیان کی خالی جگہ پر چاولوں کی پراتیں رکھ دی گئیں۔

"یہ پرات اَور کٹورہ اَندر دے دو۔" سیف اللہ نے ہدایت دی۔

چارپائیوں پہ بیٹھے مہمانوں نے مقدار کے مطابق کٹوروں سے دُودھ اُنڈیل کر چاولوں پر ڈالا اَور اُن میں اُنگلیاں ڈبو ڈبو کر کھانے لگے۔ گھر کے اَندر سے عَورتوں کی ملی جلی آوازیں آرہی تھیں۔

"آجا سرفرازے!" چاچے احمد نے بلایا۔ "لے یہ چاول کھا۔"

اعجاز اُسی طرح صحن میں کھڑا انجانے پن سے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا، پھر آکر سیف اللہ کے پاس چارپائی پہ بیٹھ گیا اَور چاولوں کے نوالے آہستہ آہستہ مُنہ میں ڈالنے لگا۔ سرفراز گو کچھ نہ کچھ سمجھ بوجھ کی عُمر کو پہنچ چُکا تھا، مگر اُسے بچّے کی پیدائش کا شعور نہ تھا، صرف ایک بِلا جُلا سا تصور ایسا تھا کہ بی بی کے چاٹی سے پیٹ کے اَندر کوئی بچّہ تھا جو کبھی نہ کبھی، کِسی نہ کِسی طرح نِکل کر آئے گا اَور ایک چھوٹے سے اصلی بچّے کی شکل میں ظاہر ہو گا۔ چاول کھا چکنے کے بعد وہ گھر کے اَندر جانے لگا تو چاچے نے سختی سے آواز دی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اَندر نہ جا سرفرازے! اِدھر آجا۔"

سرفراز آکر پھر چارپائی کی پائنتی پہ بیٹھ گیا۔ دُوسری چارپائی کی پائنتی عباس بیٹھا ایک سونٹی سے زمین پہ لکیریں کھینچ رہا تھا اَور جب تھک جاتا تو سر اُٹھا کر آسمان کو دیکھنے لگتا تھا۔

رات سنسان ہوتی جارہی تھی۔ کھُلے مَوسم کی رات تھی۔ نویں دسویں کا چاند صاف شفاف آسمان کے بیچ کھڑا تھا جِس کی روشنی سے تارے مدّہم پڑے ہُوئے تھے۔ کئی ایک آدمی چارپائیوں سے اُٹھ کر اپنے گھروں کو جاچکے تھے۔ صحن میں چاچے احمد کے علاوہ رحمت چوہان، جِس کی دیوار گھر سے ملتی تھی۔ اَور مولوی فقیرالدین پیش اِمام رہ گئے تھے۔ میراثیوں کے ٹبّر سے دو آدمی زمین پہ بیٹھے تھے۔

"دِتُو، ٹوپی پر آگ تو رکھ کے لا۔" چاچے احمد نے کہا۔

"حُقّہ بھی تازہ کر دے۔ بے مزہ ہو گیا ہے۔" رحمت چوہان بولا۔

دِتُو میراثی حُقّہ اُٹھا کر نلکے پر لے گیا۔ وہاں اُس نے باسی پانی زمین پر اُنڈیل کر حُقّہ خالی کیا جِس کی سڑاند صحن میں پھیل گئی۔ حُقّے میں تازہ پانی بھر کر اُس نے نلی پر ہونٹ جمائے اَور پھُونک مار کر دُوسرے سرے سے زائد پانی خارج کیا۔ پِھر کش کھینچ کر گُڑ گُڑ کی آواز سے پانی کا اَندازہ کیا۔ اُسی طرح کچُھ مزید پانی نکالا اَور دوبارہ کش کھینچا۔ اس عمل کو تیسری بار دُہرانے کے بعد جَب وہ پانی کی صحیح مقدار کا تعیّن کر چُکا تو تازہ حُقّے کو اُٹھا کر واپس چارپائیوں کے پاس لے آیا۔ پِھر وہ زمین پہ رکھی ہوئی حُقّے کی ٹوپی اُٹھا کر صحن کے کونے میں گیا جہاں سلگتے ہوئے اُپلوں کی ڈھیری سے دُھوئیں کی باریک سی لاٹ اس ٹھہری ہُوئی رات میں سیدھی آسمان کو اُٹھ رہی تھی۔ وہاں پہ دِتُو نے ٹوپی خالی کی، ہتھیلیوں میں مَل مل کر خُشک تمباکُو چُورا کیا۔ پِھر اس نے ٹوپی میں گُڑ کی ایک ڈلی رکھی اَور اس پہ تمباکُو بھر دیا۔ اُس کے بعد پھُونک پھُونک کر اُس نے مُردہ راکھ اُڑائی اَور اَندر سے انگارہ اُپلے چمٹے میں اُٹھا کر تمباکُو پہ دبا دیئے۔ تازہ بہ تازہ حُقّے کا ایک کش چاچے احمد کے حلق کو اَیسے جا کر لگا کہ کھانسی کے غوطے سے اُس کا سانس اُوپر کا اُوپر اَور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ پِھر رحمت نے ذرا احتیاط سے کش کھینچا اَور کھانسنے لگا۔

"کڑوا تمباکُو ہے۔" چاچا احمد سانس برابر کر کے بولا۔ "سینہ جلا کے رکھ دیا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"میرا بھتیجا پشور کی مارکیٹ سے لے کر آیا ہے۔" رحمت چوہان نے بتایا۔ "کہتا ہے اس سے کڑوا تما کو مُلک میں کہیں نہیں ملتا۔" رحمت رازدارانہ انداز میں چاچے احمد کی طرف جھک کر بولا۔ "سُنا ہے یہ تما کو اُدھر انڈیا کو بھی سمگل ہوتا ہے۔"

"بڑی قیمت پڑتی ہوگی۔" چاچے احمد نے کہا۔

"ہاں!" رحمت نے سر ہلا کر جواب دیا اور خاموش ہو گیا۔

اب اُن کے حلق تازہ حُقے کے عادی ہو چلے تھے۔ رحمت چوہان، چاچا احمد، مولوی فقیرالدین، دِتو میراثی اور اُس کا بیٹا ساجا باری باری حُقّہ گڑگڑا رہے تھے اور رات بھیگنے کے ساتھ بھاری اور دھیمی ہوتی ہُوئی آوازوں میں کوئی کوئی بات کر رہے تھے۔ اعجاز دُوسری چارپائی پہ خاموش بیٹھا تھا۔ سب کے کان گھر کے اندر کی جانب لگے تھے جہاں سے وقفے وقفے پر سکینہ کی اذیت ناک چیخ سُنائی دیتی جو دُوسری عورتوں کی آوازوں میں دب جاتی۔ عورتوں میں ماسی اور دائی کی آوازیں نمایاں تھیں۔

"صبر کر کڑیئے، صبر کر، زور لگا، زور لگا۔ اللہ پاک خُوشیاں نصیب کرے۔"

سکینہ کی چیخ ایسی بدلی ہُوئی آواز میں بلند ہو رہی تھی کہ ہر بار اُسے سُن کر باہر بیٹھے ہُوئے لوگ چونک پڑتے۔ اعجاز دونوں ہاتھوں کو ایک دُوسرے میں دبائے مروڑتا جا رہا تھا۔ مولوی فقیرالدین اُمید پر بیٹھا تھا کہ پیدائش پر اپنے مذہبی فرائض انجام دے۔ میراثی لڑکے کی آس پہ بیٹھے تھے کہ مبارک باد پیش کر کے انعام وصول کریں۔ رحمت چوہان سانجھی دیوار کے ناطے بیٹھا تھا۔ گاؤں بھر میں اب مکمل خاموشی تھی جس میں کتوں کے بھونکنے کی آوازیں اضافہ کر رہی تھیں۔ اُسی طرح سائیں کی ڈھیری سے آتی ہُوئی شبیرے کی بانسری کی آواز بھی رات کے اس سکُوت کا حِصّہ تھی۔ سائیں کی ڈھیری کوئی مزار نہ تھا بلکہ گاؤں سے باہر ایک ٹاہلی کے نیچے شاملات زمین پہ مٹّی کا ایک بڑا سا ڈھیر تھا جو سالوں سے وہاں پڑا تھا اور دُھوپ اور بارشوں کے اثر سے تقریباً پختہ ہو چُکا تھا۔ شبیرا حاجی عزیز دین کا بیٹا تھا جن کی کریانے کی دوکان تھی۔ شبیرا کوئی کام کاج نہ کرتا تھا، سارا دِن دوکان پہ لیٹا سویا رہتا تھا۔ اُس کے بارے میں مشہور تھا کہ اُس کے سر میں "عشق کا بخار" تھا۔ جیسے ہی رات ہوتی وہ سائیں کی ڈھیری پہ جا چڑھتا اور وہاں بیٹھا دیر تک بانسری بجاتا رہتا۔ کتوں کے بھونکنے اور شبیرے کی بانسری کی آوازیں اس حد تک رات میں گھل مِل چکی تھیں کہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اُن کا اپنا کوئی الگ وجُود ہی نہ رہا تھا۔ کئی سال بعد ایک روز صُبح سویرے شبیرا سائیں کی ڈھیری پر مُردہ پایا گیا۔ کِسی کو اُس کے "عشق" کی خبر نہ ہُوئی۔ کِسی نے کہا سانپ ڈس گیا ہے، کوئی بولا "سایہ" اپنا کام کر گیا ہے۔ سُنا گیا کہ شبیرے کی مَوت کے دِن کوئی فقیر اِدھر سے گزُرا اَور مَوت کا واقعہ سُن کر بولا تھا۔ "اسے اپنی جان کا دکھ تھا۔" اُس کی بات کِسی کی سمجھ میں نہ آئی تھی مگر اس روز کے بعد گاؤں کی راتوں میں کبھی بانسری کی آواز بلند نہ ہُوئی۔ اپنی بانسری کی آواز کی مانِند شبیرا جِس طرح تن تنہا دُنیا میں رہا اُسی طرح رُخصت ہو گیا۔ گاؤں کے لوگوں کا کہنا تھا کہ شبیرے کی موت کے بعد ایک عرصے تک رات کی وسیع خاموشی میں اُنہیں نیند نہ آتی تھی۔ اِن لوگوں کی زندگیوں پر گاؤں کے کِسی بڑے سے بڑے آدمی نے اَیسا اثر نہ چھوڑا تھا۔

رات آدھی نِکل گئی تھی۔ سرفراز چارپائی پہ بَیٹھا چاندنی میں صحن کی زمین پر بکائن کے سائے کے گِرد اگِرد آنکھوں ہی آنکھوں سے حاشیہ کھینچ رہا تھا کہ اس کی پسلیوں میں ایک چھڑی کی نوک چبھی۔ عباس اُس کے بازُو پہ کھڑا تھا۔ عباس نے سَر کے اشارے سے اُسے باہر چلنے کو کہا۔ سرفراز چپکے سے اُٹھ کر اُس کے ساتھ چل پڑا۔ عباس صرف بارہ سال کا تھا مگر قد میں سرفراز سے پانچ سال بڑا لگتا تھا۔ خاص طور پر جَب وہ سکُول سے آکر کپڑے اُتارتا اَور چاچے احمد کے ساتھ مِل کر بڑے بڑے کھیتوں میں ہل چلایا کرتا تو جوان آدمی نظر آتا تھا۔ دروازے سے نِکل کر عباس اپنی بَیل گاڑی سے بچتا ہُوا دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ گلی سنسان پڑی تھی۔

"ڈنڈی دکھاؤں؟" وہ بولا۔

"ہاں!" سرفراز نے کہا۔

عباس نے دونوں ہاتھ رانوں پہ ملنے شُروع کئے اَور پھر جلدی سے تہمد اُٹھا دیا۔ سرفراز اَور اُس کے ہمجولی کبھی کبھی، جَب مستی اُن کے سَر پہ سوار ہوتی اَور آس پاس کوئی ماسٹر نہ ہوتا، تو چھُٹی کے بعد گراؤنڈ کے اَندر رُک کر ایک دُوسرے کو اپنی اپنی ڈنڈیوں کی جھلک دکھایا کرتے تھے، مگر اُس وَقت چاند کی روشنی میں عباس کی ڈنڈی کا حجم دیکھ کر سرفراز دم بخود رہ گیا۔

"اب تُو دکھا۔" عباس نے حکم دیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سرفراز اُسی طرح ہاتھ لٹکائے کھڑا رہا تو عباس نے اُس کے سر پہ چھڑی لہرا کر دھمکی دی۔ "دکھاتا ہے کہ نہیں؟"

سرفراز نے آہستہ آہستہ اپنا نالا کھولنا شروع کیا۔ عباس نے ہاتھ سے جھٹک کر اُس کی شلوار گرا دی۔ سرفراز جتنا بھی زور لگا سکتا تھا لگا چکا مگر عباس کے ڈر سے اُس کی ڈنڈی نہ بننی تھی نہ بنی۔

"جا نمردا---" عباس نے دھکا دے کر اُسے گرا دیا اور ایک چھڑی اُس کے کندھے پر جمائی۔

اُسی وقت جمیلہ اندر سے نِکل کر اُن کے پاس آ کھڑی ہُوئی۔ سرفراز اُٹھ کر نالا باندھ رہا تھا۔ جمیلہ کی اوڑھنی ایک کندھے پہ لٹک رہی تھی۔ اُس کے سینے پہ ذرا ذرا گوشت نکلنا شروع ہو چُکا تھا۔ سرفراز کے دِل میں خیال آیا کہ اگر وہ جا کر اس سے لپٹ جائے تو شاید اُس کی ڈنڈی بن جائے۔ جمیلہ نے باری باری دونوں کی جانب دیکھا۔

"بشرمو!" وہ بولی۔

عباس نے ایک تھپڑ اُس کے مُنہ پہ جمایا۔ "چل اندر۔"

"ابے کو بتاتی ہُوں۔" جمیلہ بسورتی ہُوئی بولی۔

"تیری جان نکال دوں گا۔"

عباس نے آنکھیں دکھائیں۔

جمیلہ گال سہلاتی ہُوئی گھر کے اندر چلی گئی۔

"کچے دُودھ کی دھاریں لیتا ہُوں۔" عباس بولا۔ "تھن سے مُنہ لگا کر، ساری طاقت اُس میں ہوتی ہے۔" اُس نے دوبارہ تہمد اُٹھا کر دکھایا۔ اُس کی ڈنڈی اُسی طرح تنی کھڑی تھی۔ سرفراز اُس کے رعب سے پیچھے ہٹتا ہُوا صحن میں داخل ہوا اور چارپائی پہ اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر کے بعد نیند نے اس پہ غلبہ پا لیا اور وہ وہیں پہ لیٹ کر سو گیا۔ اس دِن سے لے کر وہ جب بھی عباس سے ملا اُس کی چھلتی ہُوئی نظر ایک بار عباس کی رانوں کے بیچ سے ضرور گزرتی اور ساتھ ہی کچے دُودھ کی دھاروں کی یاد آتی تھی۔

پو پھٹ رہی تھی جب شور سے سرفراز کی آنکھ کھل گئی۔ "جوڑا--- جوڑا--- جوڑا---" ہر طرف لوگ پکارتے پھر رہے تھے۔ سب سے زیادہ شور میراثیوں کے باپ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بیٹے نے مچا رکھا تھا جو تالی بجا بجا کر اَور گا گا کر اعجاز اَور چاچے احمد کو مبارک باد دے رہے تھے۔ سرفراز نے آنکھ کھولی ہی تھی کہ مولوی فقیرالدین فجر کی نماز پڑھا کر اُس کی چارپائی پہ آ بیٹھا۔ گاؤں کی عَورتیں ایک ایک، دو دو کر کے، اپنے خوابیدہ چہرے ملتی، اوڑھنیاں سروں پہ جماتی، رات کے پہنے ہُوئے کُرتے سیدھے کرتی، صحن سے گزُر کر اَندر جارہی تھیں۔ گھر کے اَندر اب سکینہ کی چیخیں رُک چکی تھیں اَور اِن کی جگہ عَورتوں کے شور و غوغا نے لے لی تھی۔ خُوشی کی، ہنسی مذاق کی آوازیں اُٹھ رہی تھیں۔ کبھی کبھی کوئی عَورت ترنگ میں آکر کِسی گیت کا ایک بول اُٹھا دیتی۔ بیچ بیچ میں چند سیکنڈ کے لِئے نہایت ننھی سی رونے کی آواز آتی جیسے کوئی بلی کا بچّہ بلک رہا ہو۔ گاؤں کے آدمی اپنے کام کاج کو جاتے ہُوئے رُک کر اعجاز کو اَور چاچے احمد کو مبارک بادیں دیتے جارہے تھے۔ سُورج ذرا اُوپر ہوا تو رحمت چوہان کے گھر سے دُودھ والے بھاری گڈوے میں اُبلتی ہُوئی گرم چائے جِس پہ الائچیوں کے چھلکے تیر رہے تھے، بن کر آگئی۔ ساتھ ہی نظام دین اعوان نے پرات بھر کر تر تراتا ہُوا گڑ کا حلوہ اَور رات کی بچی ہُوئی روٹیاں گھی میں تل کر بھیج دیں۔ سب نے آدھی آدھی روٹی پہ اپنے حِصّے کا حلوہ رکھا اَور ناشتہ کیا۔ بچا ہوا حلوہ اَور روٹیاں اَندر گھر میں عَورتوں کے لِئے بھیج دیا گیا۔ پھر سب نے چائے کے پیالے بھر بھر کے پیئے۔ دِتّو میراثی نے حُقّہ تازہ کیا۔ اعجاز نے صرف ایک دو نوالے اپنے حِصّے کے کھائے، باقی پرات میں چھوڑ دیا۔ اُس کے چہرے پر ابھی تک وہی گومگو کی حالت تھی، نہ خُوشی نہ غم، صرف ہونٹوں سے مُسکرا مُسکرا کر لوگوں کے دُعا سلام کا جواب دے رہا تھا۔ چاچا احمد اَور مولوی فقیرالدین اَندر جانے کو تیار بیٹھے تھے۔ جب بلاوا آیا تو دونوں نے اعجاز کو ساتھ لے جانے کی کوشش کی مگر اعجاز نے نفی میں سَر ہلا دیا اَور چارپائی پہ بیٹھا رہا۔ دو ایک بار کہنے کے بعد چاچا احمد اَور مولوی فقیرالدین مایُوس ہو کر اَندر کی جانب چل پڑے۔ دروازے پہ ایک لحظہ رُک کر چاچا زور سے کھنکارا۔ اَندر سے ماسی نے آواز دی۔ "آجاؤ۔" دونوں مرد اَندر داخل ہو گئے۔ سرفراز نے بھی اُن کے پیچھے پیچھے اَندر قدم رکھا۔ اَندر عَورتوں کا ایک جمگھٹا تھا۔ مردوں کو دیکھ کر اُنھوں نے اپنی اوڑھنیاں دُرست کرنی شُروع کر دیں۔ "مبارک ہو، چاچا!" نظام دین اعوان کی بیوی نے آگے بڑھ کر کہا۔ سکینہ گردن تک کھیس اوڑھے آرام سے لیٹی تھی۔ اُس کے چہرے پر اب اِن اذیت ناک چیخوں کی رمق تک نہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھی۔ اُس کی آنکھوں میں ایک پُرسکون شوق کی روشنی تھی۔ اُس کی بغل میں کھیس سے ڈھکے ہُوئے دو چھوٹے چھوٹے کپڑے کے بنڈل لپٹے لپٹائے رکھے تھے جن سے دو چُوہوں جیسے سر باہر نکلے ہُوئے تھے۔ چاچے احمد نے شہد میں اُنگلی ڈبو کر ایک کے مُنہ میں ڈالی، پھر مولوی فقیر الدین نے گڑھتی کا یہ عمل دُوسرے کے ساتھ دہرایا۔ سرفراز چارپائی سے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ اچانک اُس کے آگے بہت سی دھکم پیل کرتی ہُوئی عورتیں آگئیں۔ اُس وقت اسے محسُوس ہوا کہ کمرے کے اندر ایک دربند، حبس آلود سی بُو پھیلی تھی، جیسے رُکی ہُوئی اُبکائی کا ڈکار ہو۔ اُس کا دم گھٹنے لگا۔ وہ کمرے سے نکلنے کو پلٹا تو اُس کے کان میں مولوی صاحب کی آواز پڑی جو ہلکے لحن میں اذان دے رہے تھے۔ وہ صُبح سرفراز کے بھتیجوں حسن اور حسین کی پیدائش کا دِن تھا۔

جب لوگوں کا آنا جانا کم ہوا اور چاچے احمد نے گاؤں کے نائی کو بلا کر پلاؤ کی دیگ چڑھانے کا انتظام شروع کر دیا تو رات بھر کے جاگے ہُوئے اعجاز نے چارپائی کھینچ کر سائے میں کی اور لیٹ کر آنکھیں موند لیں مگر نیند اُس کے سر سے غائب تھی۔

"سکُول سے چھُٹی کر لو۔" چاچے احمد نے کہا۔

"ہاں!" اعجاز نے ہولے سے جواب دیا۔

اس کے دماغ میں ایک سے ایک خیال یلغار کرتا چلا آرہا تھا۔ صُبح سویرے سے اُس کے ذہن میں صرف چار چیزیں جڑی تھیں۔ عقب میں سکینہ کا چہرہ تھا۔ آگے دو نوزائیدہ بچوں کے ہیولے تھے جن کے نقوش وہ خیال کے باوجُود یاد نہ کر سکتا تھا۔ اِن سے آگے کنیز کی شبیہ تھی، تیکھی، تیز اور آتش گیر مگر سب سے آگے، اور سب سے اُوپر ایک شرمندگی کی شکل تھی جس کی صُورت اس کے دماغ میں ایک بھاری، گدلے، بے ترتیب سے پتھر کی مانند دھری تھی۔۔۔۔۔ سکُول سے نکالے جانے کی ذلت۔ اس بوجھ سے نکلنے کے لئے وہ پچھلے بیس گھنٹے سے رینگ رہا تھا۔ یکے بعد دیگرے اُس کے ہاتھ میں دو سہارے آئے تھے، ایک کنیز کا، دُوسرا اپنے نوزائیدہ بچوں کا۔ مگر اس ذلیل پتھر کا بوجھ سب سے بھاری تھا۔ وہ اس خیال سے ابھی تک چھٹکارا نہ پا سکا تھا کہ کِسی اور کے ہاتھ کے لکھے ہُوئے استعفے پر وہ خاموشی سے دستخط کر کے کیوں وہاں سے چلا آیا تھا۔ نہ اُس نے کوئی جواب دیا نہ مزاحمت کی۔ وہ کہہ سکتا تھا کہ اب یہ گورنمنٹ سکُول بن چُکا ہے، آپ مجھے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

برخواست کریں، میں انڈسٹریل کورٹ میں جاؤں گا۔ اگر یہ یونین ہی کی بات تھی تو وہ ٹھیک سے یونین کی مدد لے سکتا تھا۔ اُسے یاد آیا کہ ہیڈ ماسٹر نے چالاکی سے مارشل لاء کا ذکر کرکے اُسے ڈرا دیا تھا مگر یہ کوئی ہمت ہارنے والی بات تو نہ تھی۔ اعجاز کو نہ ہیڈ ماسٹر پہ غصہ تھا نہ کسی اَور پہ، صرف اپنے آپ پہ تھا۔ اُسی طرح گھومتا گھامتا ہُوا اُس کا خیال اس ڈگر پہ چل نِکلا کہ زِندگی میں اُس نے کوئی معرکہ سَر نہیں کیا تھا۔ ایک آدھ، اس نے سوچا، معمولی میدان مارا تھا، گو اس زمانے میں وہ معرکہ ہی معلوم ہوتا تھا۔

مویشیوں کی منڈی کے موقع پر، اعجاز نے یاد کیا، نورپُور سے ہمارا کبڈی کا مقابلہ ٹھہرا تھا۔ نورپور والوں نے سرگودھے سے ایک کھلاڑی جیجا ترکھان بلایا تھا جِس کی سارے پنجاب کے اَندر دُھوم تھی۔ پانچ فٹ کا آدمی اَور بدَن اَیسا کہ جیسے تنا ہوا گدر فٹ بال ہو۔ جَب تیل اَور پسینے میں نہایا ہوا آتا تو مچھلی کی مَانِند ہاتھ سے پھسل جاتا تھا۔ چھُٹکا سا آدمی، نہ دائیں کو جھانسہ دیتا نہ بائیں کو، تلی پہ تلی مارتا اَور کھڑا کھڑا چھلانگ لگا کر مقابل کو سَر سے ٹاپ جاتا تھا۔ میں ایک دو بار دیکھ کر اس کا داوٗ بھانپ گیا تھا۔ میں نے اس پہ ہاتھ ڈالنے کا ارادہ کر لیا۔ وہ کوڈی کوڈی پکارتا ہُوا آیا تو ہم چار لڑکوں کے حلقے نے اُس کا سامنا کیا۔ میں نے دُوسرے تینوں کو اشارے سے مطلع کر دیا تھا کہ یہ بھارُو میرا ہے۔ دِل ہی دِل میں مَیں نے اپنے سَر کے برابر اس مقام کا تعیّن کر لیا تھا جہاں سے اس کے اُڑتے ہُوئے جِسم کا گزُر ممکن تھا اَور پھر اُسی جگہ پر اپنی توجہ مرکوز رکھی۔ اس بات کی میں داد دیتا ہوں کہ اس لڑکے نے ہم چاروں کو جانچنے کے بعد یہ پہچان کر لی کہ میں ہی ہوں جِس نے اس پہ وار کرنے کا تہیہ کر رکھا ہے۔ اُس نے میرے سامنے آکر للکار ماری اَور ساتھ ہی مُجھے ہاتھ سے چھو کر گیند کی مَانِند اُچھلا، جیَسے ہی اُس کے پیر زمین سے اُٹھے، میں نے صحیح لمحے کا اَندازہ کرکے اُوپر اپنے بازُوؤں کا حلقہ باندھ دیا۔ میرا اَندازہ دُرست نِکلا، میرے حلقے کے اَندر اُس کی چھاتی مقید تھی۔ مَیں نے اُسے ہوا میں اُچک لیا تھا۔ اس جِن جیسے کے اَندر مَیں نے اُسے اس طرح جکڑا کہ اُس کا نکلنا محال ہو گیا۔ میرے جوش کی حالت اَیسی تھی کہ اُس کی پُشت کے پیچھے میرے ہاتھ آپس میں یُوں گندھے تھے کہ جیَسے کِسی رسّی کو بل دے کر گانٹھ دے دی گئی ہو۔ اِس چنگل سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لِئے اس اللہ کے بندے نے میرے کانوں کے اُوپر دھولوں پہ دھولیں جمانی شرُوع کر دیں۔ اُس کی لوہے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایسی کلائیاں ہتھوڑے کی ضربوں کی مانند میرے سر پہ لگ رہی تھیں۔ بعد میں کئی روز تک بائیں کان سے مجھے کچھ سُنائی نہ دیا تھا۔ اِن دھولوں سے بچنے کی خاطر مَیں نے اُسے اپنے سینے کے ساتھ بھینچنا شروع کر دیا۔ میرے لِئے یہ جان کی بازی تھی کیونکہ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ اَور ایک منٹ تک اُس کی دھولیں میرے سر پہ گرتی رہیں تو میری رگیں پھٹ جائیں گی اَور کھڑے کھڑے میرا دم نِکل جائے گا۔ یہ ایسا وَقت تھا جب کبھی کبھی کھیل کے مقابلے کے اَندر آدمی کو اپنا آخری وَقت دکھائی دے جاتا ہے اَور وہ اپنے بدَن کے علاوہ اپنی رُوح کی تمام تر سچائی کے مقابل آ کھڑا ہوتا ہے۔ اُس وَقت میں نے پُورے زَور کے ساتھ جو کسا تو اُس کا پیٹ اُس کی کمر سے جالگا اَور اس کی سانس اُوپر کی اُوپر اَور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ جب اپنے بازُوؤں میں مجھے اُس کا بدَن ڈھیلا پڑتا ہُوا محسُوس ہوا تو مَیں نے اُس کے مُنہ کی طرف دیکھا۔ اُس کا دم ٹُوٹ چُکا تھا۔ میرے ہاتھوں کی اُنگلیاں خُون رکنے کے باعث جکڑی گئی تھیں۔ میں نے کوشش سے اُنہیں جُدا کیا اَور بازُو کھول دیئے۔ جیجا ترکھان گیلے کپڑے کی مانند زمین پہ جاگرا۔ پاؤں کے بل بیٹھا وہ چہرہ اُٹھا کر یُوں مجھے دیکھنے لگا جیسے اسے پتا ہی نہ چلا ہو کہ اُس کے ساتھ کیا بیت گئی ہے۔ پھر وہ اُٹھ کھڑا ہوا اَور چہرے پہ ہاتھ پھیر کر بولا۔ "پتر بدلہ لے کر چھوڑوں گا۔" مگر اُس کے بعد پھر کبھی میری اس سے مڈبھیڑ نہ ہُوئی۔ نورپور کے لوگوں کا کہنا ہے کہ ہر سال اُسے بدلے کے لئے واپس آنے کی خاطر رقم کی پیشکش کی جاتی ہے مگر اُس کی جانب سے کوئی جواب نہیں ملتا۔ میں نے اس پہ ایسی ذلت وارد کی تھی کہ وہ کھلاڑی جِس نے کل پنجاب کے بڑے بڑے مقابلوں میں نام کمایا تھا، آئندہ بھی جو میدان مارنا ہے مار لے گا مگر اس شکست کو عُمر بھر نہ بھُولے گا۔ جب مَیں نے اُسے زمین پہ گرایا تو تماشائیوں میں ایک غلغلہ بلند ہُوا۔ ہمارے گاؤں کی ٹولی نے اپنے ڈھول پر تھاپ اُٹھائی اَور ناچتے ہُوئے میدان میں گھُس آئے۔ منتظمین نے اُنہیں روکنے کی کوشش کی مگر وہ بھاگتے ہُوئے سیدھے میرے پاس آئے اَور مجھے کندھوں پہ اُٹھا کر تماشائیوں کے حلقے کے ساتھ ساتھ چکّر لگانے لگے۔ میں نے اپنے گاؤں کی ناموری کمائی تھی۔ تماشائیوں میں ایک جانب کو عَورتوں کی ٹولی کے ہمراہ دوپٹے میں سر چھپائے سکینہ کھڑی تھی۔ اُس وَقت ابھی ہماری شادی نہ ہُوئی تھی اَور چاچا احمد اپنے سارے ٹبّر کو لے کر منڈی میں ڈنگر خریدنے کو آیا ہُوا تھا۔ بعد میں سکینہ نے مجھے بتایا کہ مجھے لوگوں کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کندھوں پہ چڑھا اَور لوگوں کو ڈھول کی تال پہ میرے اِرد گِرد ناچتے ہُوئے دیکھ کر وہ بلک بلک کر رونے لگی تھی۔ سکینہ اَور میرے درمیان کچھ ایسی چیزیں مشترک ہیں جن کا کوئی بدَل نہیں۔ پھر یہ کیا بات ہے کہ اس عَورت کا تصور میرے دِل سے نہیں جاتا جسے میں نے کل پہلی بار دیکھا تھا۔ مجُھے یہ بھی احساس ہے کہ وہ اِن لوگوں میں سے تھی جِن پہ میں ایک کے بعد دُوسری نظر ڈالنا گوارا نہ کیا کرتا تھا۔ اُس کے میلے کپڑے موٹی سلائی سے سیے گئے تھے اَور ایک آدھ بے مہارت سا پیوند لگا تھا۔ اُس کے بال چپڑی ہُوئی موٹی موٹی لٹوں میں لٹک رہے تھے اَور کئی روز سے دھوئے نہ گئے تھے۔ سب سے پہلے مَیں نے اُسے سو گز کے فاصلے سے دیکھا اَور گو اُس وَقت وہ ہاتھ پھیلائے آہ و بکا کر رہی تھی مگر پہلی ہی نظر میں، جَب اس مقام سے مجُھے اُس کا چہرہ بھی نظر نہ آ رہا تھا، وہ مجُھے ایک روتی چلّاتی ہُوئی مزدُورنی نہیں بلکہ ایک عَورت کی شکل میں دکھائی دی تھی۔ پچھلے رُخ کی ہوا چل رہی تھی جِس سے اُس کا کُرتہ اس کے بدَن سے چمٹا ہُوا تھا اَور اُس کے کھڑے ہونے کے اَنداز میں، اس کے پھیلے ہُوئے بازُوؤں کی بیکسی کی بجائے مجُھے ایک بانکپن نظر آیا تھا اَور اب بے معلوم طور پہ میرے سَر سے دِن بھر کا بوجھ گویا ہوا میں تحلیل ہو گیا تھا۔ قریب پہنچ کر مَیں نے اُس کا چہرہ دیکھا، اُس کے گالوں کی اُبھری ہُوئی ہڈیوں پہ تنی ہُوئی ملائم سیاہ مخمل کی سی جلد اَور دُودھ جیسے سفید دانت اَور پتلے کُرتے کے اَندر سبز آموں کی سی چھاتیاں دیکھیں تو یُوں محسُوس ہوا جیسے میرے حواس اس عَورت کے اَنداز کے اَندر جکڑے گئے ہُوں۔ پہلی نظر سے آخری تک، وہ ایک عَورت تھی مگر ساتھ ہی وہ ایک اَنداز کی تصویر بھی تھی جیسے کہ اُس کا وجُود ہوا کی چند لکیروں سے تشکیل پایا ہو۔ جَب وہ سڑک پہ چڑھ کر مجھ سے پرے جا رہی تھی تو ہر قدم کے ساتھ اُس کے بدَن کے مُختلف اعضاء الگ الگ حرکت کر رہے تھے، مگر جُوں جُوں دُور ہوتے جاتے تھے، شَام کے دُھندلکے میں ایک باہم مربُوط اَور بے وزن خاکہ بناتے جا رہے تھے جیسے کِسی پرندے کی اُڑان ہو۔ جَب میں گھر پہنچا تو نقشہ ہی مُختلف تھا۔ خُدا خُدا کر کے صُبح ہُوئی اَور سکینہ کی چیخوں سے نجات ملی تو دُنیا ہی بدَل چکی تھی۔ ایک کی بجائے دو اَور دونوں ہی لڑکے، چار چار سیر کے صحت مند پٹھے۔ میں بھی حیران تھا کہ سکینہ کے پیٹ میں شاید بچّے کے علاوہ ہوا بھر چکی ہے جو اتنا پھُول گیا ہے مگر سب لوگ کہتے تھے چاچے احمد کا سارا ٹبّر چوڑی ہڈی کا بنا ہے، ہوا کا گولہ کہاں سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آئے گا یہ نر بچّہ ہے اَور تنومند ہے۔ یہ کسے پتا تھا کہ یہ ایک نہیں دو دو ہیں۔ مجھے ہوا میں اُلٹی چھلانگیں لگانی چاہئیں، مگر یا اللہ، اس ایک دِن اَور رات میں تُو نے کتنی وارداتیں میرے اُوپر نازل کر دی ہیں-----"

زمینداری، جسے وہ ایک سال قبل اپنی ساری اراضی رہن سے چھڑا کر شرُوع کر چُکا تھا، کے سوا سکُول کی نوکری اعجاز کی روزی اَور عزت کا ذریعہ تھی۔ اب اس کے کھو جانے کے واقعہ نے اُسے پہلی بار اپنی بنی بنائی محدود زِندگی سے باہر نِکل کر ہاتھ پاؤں مارنے پہ مجبور کر دیا تھا۔ اُسی کیفیت کے اَندر، اپنے ذہن کی تاریکی کو کم کرنے کی خاطر اُس کا خیال ماضی کے اِن روشن لمحوں کی جانب لپکنے لگا تھا جو کبھی کبھار ہر اِنسان کی عمُر میں آتے ہیں اَور جن میں آدمی اپنے روز و شب کے کَون و مکان سے اُوپر اُٹھ کر ایک اَور جہان کی جھلک دیکھتا ہے۔ یہی سہارے اب اُس کی آنکھوں کے پردوں پہ تیر رہے تھے۔ اُس نے وہ وَقت یاد کیا جَب وہ اپنے سُسر چاچے احمد سے ملنے اس کے گاؤں گیا ہُوا تھا۔ کھیتوں کو جاتے ہُوئے رمضان ماچھی نے مذاق مذاق میں چوہدری احمد کو ہل چلانے کے مقابلے کو للکارا تھا، جِسے سُن کر اعجاز کی طبیعت چمک اُٹھی تھی اَور اُس نے آگے بڑھ کر مقابلے کی شرط کا جواب دِیا تھا۔ پِھر چاچے احمد کے ایک ایکڑ کے رقبے میں اُس کا ماچھی کے ساتھ مقابلہ ہُوا تھا۔ اس کھیت میں پچھلے موسم کے اَندر کپاس کی فصل لگی تھی۔ اب پھٹی کی چنائی کے بعد پَنچھٹی بھی گٹھوں میں باندھ کر خشک بالن کے کوٹھوں میں بند کر دی گئی تھی۔ اب اس کھیت کو گیہوں کی بیائی کے واسطے تیار کرنے کا وَقت آیا تھا۔ چاچا احمد کچُھ مقابلے کی لذت اَور کچُھ اس خیال سے کہ مُشقّت کے بغیر اُس کے کھیت کی مٹّی اُلٹی جا رہی تھی، خُوش خُوش کھڑا تھا۔

رمضان ماچھی نمبرداروں کے ڈیرے پر جا پہنچا اَور اس وعدے پر کہ اگلے روز وہ اُن کے کھیت میں بیگار کے طور پہ ہل چلا دے گا، اُن کے بہترین سفید بیلوں کی جوڑی مانگ کر لے آیا۔ ساتھ نمبرداروں کے دو لڑکے بھی چلے آئے۔ ماچھی نے ہل کندھے سے اُتار کے بَیل جوت دیئے۔ ماچھی کا چھوٹا بیٹا بھاگتا ہُوا گاؤں پہنچا اَور وہاں رکے بغیر، مقابلے کی خبر کا اعلان کرتا ہوا دُوسرے سرے سے نِکل کر ہانپتا ہُوا واپس آ پہنچا۔ دو دو، تین تین کے ٹولوں میں لوگ اُٹھ کر مقابلے کے کھیتوں میں آنا شرُوع ہُوئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کھیت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے گِرداگِرد تماشائیوں کا دائرہ بن گیا۔ دو منصف مقرر ہُوئے جنھوں نے قدموں سے ماپ کر کھیت کے عین درمیان میں لمبائی کے رُخ سونٹی سے لکیر کھینچ دی۔ پھر دونوں فریق اپنے ہل ہانک کر اپنے اپنے نصف کے مخالف سِروں پر جا کھڑے ہُوئے۔ مقابلے کا دستور مقرر تھا کہ دونوں فریق اپنے اپنے سِروں سے چلیں گے اَور درمیان میں ایک دُوسرے کے برابر سے گزُرتے ہُوئے مخالف سمتوں میں بڑھتے جائیں گے حتیٰ کہ حد پہ پہنچ کر واپس مُڑیں گے۔ مقابلے میں اصل مرحلے کا مقام یہی موڑ تھا۔ ہل چلانے کا عام دستور قطعہ زمین کی حدود کے ساتھ ساتھ چلتے ہُوئے دائرے کو تنگ کرتے جانے کا تھا تاکہ بَیل رُخ توڑے بغیر چلتے جائیں اَور تنگ موڑوں کا مسئلہ پیش نہ آئے۔ جب کہ مقابلے کے اَندر سیدھی لکیر کے آخر پہ پہنچ کر اُلٹے پاؤں مُڑنے اَور لکیر کے ساتھ لکیر ملا کر واپس آنے کا نقشہ تھا۔ جتنی مشاقی سے اَور کم سے کم وَقت میں کوئی بیلوں کی جوڑی کو ایک سو اسّی کے زاویئے پہ موڑنے اَور ہل اُٹھا کر نئی زمین پر گاڑنے کا اہل تھا اُتنا ہی قابل وہ اس کھیل کا کھلاڑی سمجھا جاتا تھا۔ جَب دونوں "ہالی" اپنے اپنے کونوں پہ جم چکے تو ہلا لا لا لا--- کر کے مقابلہ شرُوع ہُوا۔ تماشائیوں کے ہجوم سے ایک دبے دبے شور کی گونج اُٹھی۔ دونوں منصف مخالف سمتوں میں، اپنا اپنا تہمد ٹخنوں سے اُوپر اُٹھائے، فریقین کے ساتھ ساتھ چلتے کھیل کے اصولوں پہ کڑی نظر رکھے ہُوئے تھے، کہ ہلوں کے پھل کم سے کم تین اُنگل زمین کے اَندر رہیں اَور لکیروں کے درمیان کوئی ننگی زمین نظر نہ آنے پائے۔ "وگدیاں نُوں واہن سانجھے، وگدیاں نُوں واہن سانجھے---" کِسی تماشائی نے جوش میں آکر نعرہ لگایا۔ "ہلا لا لا لا---" ساتھ ہی ڈھول کی تیز مانوس دھمک سُنائی دی جو تیزی سے قریب آتی جا رہی تھی۔ میراثی کو خبر ہو چکی تھی۔

خیال کے اس سہارے پہ تکیہ کئے، آنکھیں میچ کر لیٹے اعجاز کے اعصاب پہ گہری آرام دہ کیفیت طاری تھی۔ اُسے ہل مقابلے کے آخر تک پہنچنے کی ضرورت محسُوس نہ ہُوئی۔ اُس کے دِل میں یہ اطمینان بخش عِلم تھا کہ اس نے وہ مقابلہ سوا لکیر کی گنجائش سے جیت لیا تھا۔ چند لمحے تک وہ اُسی طرح لیٹا رہا، مگر جیسے ہی مقابلے کا تصور اُس کے سامنے سے ہٹا، اس کے دِل کی ابتری لوٹ آئی، جیسے اتنی دیر تک عقب میں دھاک لگائے بیٹھی ہو۔ کِسی خیال کے سہارے نے اُس کا ساتھ نہ دیا۔ اُس نے آنکھیں کھول دیں اَور چارپائی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے اُٹھ کر گھر سے نِکل گیا۔

نُور پُور کی ڈسپنسری کے احاطے میں، دیوار سے ٹیک لگائے ارشاد اَور کنیز بیٹھے تھے۔ ارشاد نے کھیس کی بکل کھول کر اپنی پٹیاں دکھائیں۔ "ملہم پٹی ہو گئی ہے، آپ کا احسان ہم نہیں اُتار سکتے ملک صاحب!------"

کنیز نے ربڑ کی چپلی پہن رکھی تھی جِس کے تلے آدھے گھِس چکے تھے اَور ننگی ایڑیاں زمین پہ گھسٹتی تھیں۔ وہ کچی زمین پر اَیسے آرام سے ٹانگیں اپنے سامنے لمبی پھیلائے بیٹھی تھی جیسے مٹّی کا اُس کے دِل میں کوئی خوف نہ ہو۔ اعجاز کو خیال آیا کہ وہ ایک ایسی عَورت تھی جِس نے اِتنے عرصے سے چارپائی پہ سو کر نہ دیکھا تھا کہ اُسے بھُول ہی چکی تھی اَور اب زمین کے ساتھ اُس نے سیدھا رشتہ جوڑ لیا تھا۔ اُس کے ہاتھوں، پاؤں اَور کندھوں کی نوک دار ہڈیاں عسرت کے اَیسے نشان تھے گویا اُس کے بدن پہ غربت کی تختیاں آویزاں ہوں۔ مگر تنگ دستی نے اُس کے چہرے کا کچُھ نہ بگاڑا تھا۔ اُس کی آنکھوں کی چمک، جلد کی سیاہ ملائمت، ٹھوڑی کی اُٹھان اَور سفید دانتوں کے گِرد ہونٹوں کی ہلکی سی مُسکراہٹ کا تاثر جو بدحالی میں بھی چہرے کا مُستقِل جزو بنا رہتا تھا، یہ چیزیں اپنی جگہ پہ قائم تھیں۔ پھر اُس کی سرکش چھاتیاں تھیں، جو اُس کے بیٹھنے کے اس اَنداز میں بھی جب کہ اس کی کمر میں ہلکا سا خم تھا، کُرتے کے اَندر اپنے جان دار خدوخال میں نمایاں تھیں۔ اُس کا چھ سالہ بچّہ اُس کی بغل میں بَیٹھا تھا۔

"کوئی بڑی چوٹ تو نہیں آئی؟" اعجاز نے پُوچھا۔

"جی درد بڑا اُٹھتا ہے، سانس نہیں نِکلتا۔ چھوٹے ڈاکٹر صاب کہتے ہیں شہر جاکر ہسپتال سے تصویر کھنچواؤ، مالوم ہوتا ہے پسلیوں کو ضرب آئی ہے۔ ہم غریب لوگ ہیں ملک جی، نہ قدم اُٹھتا ہے نہ ہاتھ پڑتا ہے، کدھر سے کرائے خرچ کے جائیں۔ آپ ایک اَور مہربانی کریں، ٹھیکیداروں سے آپ کی سلام دُعا ہے، اِن سے کہہ سُن کر ہفتے دس دِن کی چھُٹی لے دیں۔"

"ڈاکٹر ٹھیک کہتا ہے۔" اعجاز نے کہا۔ "آنے جانے کا کرایہ میں دے دوں گا،

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہسپتال میں تصویر مفت اُتر جائے گی۔ ٹھیک پتا چلے گا تو علاج بھی دُرست ہو گا۔"

"ہسپتال کی بات چھوڑیئے ملک صاب!"

"کیوں؟"

"ہم غریبوں کو وہاں کون پُوچھتا ہے۔ ایک ٹیکہ ٹھوک کر لٹا دیتے ہیں۔ پھر مر کر ہی خلاصی ہوتی ہے۔ آپ ٹھیکیداروں سے سفارش کر دیں تو میں چار دِن میں تندرست ہو جاؤں گا۔ اِس بے وکوف عورت نے ایک اَور ننٹا میرے سر پر کھڑا کر دیا ہے۔ پتا نہیں اب کیا بنے گا۔ اللہ میرے اُوپر رحم کرے۔ ہائے۔۔۔"

اعجاز نے سوالیہ نظروں سے کنیز کو دیکھا۔

"چل چُپ کر۔" کنیز تنک کر بولی۔ "ہائے ہائے کر کے کان کھا گیا ہے۔ مَیں پرچہ کرا کے ہی رہوں گی، چاہے جان چلی جائے۔"

"سُن لیا ملک صاحب؟" ارشاد بولا۔ "یہ اڑیل کھچر میرے اُوپر مُصیبت لا کر رہے گی۔ ہمیں پیشگی کی متھاجی ہے۔۔۔"

"پیشگی، پیشگی۔" کنیز بولی۔ "میں پیشگی کی متھاج نہیں، تُو ہے۔ میں تو تیرے پیچھے لگ کر ٹھُڈے کھا رہی ہُوں۔ پہلے تو بڑی عیش کر رہا تھا جو اب مُصیبت آئے گی؟ ہائے ہائے۔۔۔" کنیز نے آواز کھینچ کر ارشاد کی نقل اُتاری۔

"کتنی پیشگی ہے؟" اعجاز نے پُوچھا۔

"تین ہزار،" کنیز نے جواب دیا۔ "دو ہزار لِئے تھے، تین ہزار چڑھ گئے ہیں۔ وہ بھی نہ کسی کام نہ مکام، سارا کھوہ کھاتے گیا۔"

"کیا ہُوا؟"

"اِس نے اَپنے مامے کی ضمانت دی تھی۔ اِس کو پُلس نے دوڑا دیا اَور ضمانت کی رقم کھا گئے۔"

"چل اب چُپ کر خُدا کی بندی،" ارشاد کراہتے ہُوئے بولا "میری جان نِکل رہی ہے، تُو پرچہ کرا کے مُجھے ختم کرا دے گی۔ اِس کی عقل پیروں میں ہے ملک صاب، آپ رسُوخ والے ہیں، اِس کو سمجھائیں۔"

"معاملہ کیا ہے؟" اعجاز نے پُوچھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"معاملہ کیا ہو گا جی، ایک مُصیبت گئی نہیں، دُوسری آ گئی----" ارشاد نے بتانا شُروع کیا۔

"چل مُنہ بند کر۔" کنیز بات کاٹ کر بولی، "رات کو اِس کی پٹی ہو رہی تھی ملک جی، تو پُلس والے ایک زخمی کو لے کر آئے۔ تھانیدار نے شادے کو دیکھ کر پُوچھا اِس کے ساتھ کیا گزری، تو میں نے----"

"مَیں نے آنکھ کے اشارے سے اسے منع بھی کیا ملک صاب مگر----"

"مگر وگر، مگر وگر، نامُراد کبھی زُبان بھی کھولے گا کہ گُنگے کا گُنگا قبر میں چلا جائے گا؟ ملک جی، مَیں نے جو واردات تھی صاف صاف بیان کر دی۔ زیادتی کو بندہ کب تک سہارے۔"

"اب تھانیدار صاب مجبور کرتے ہیں کہ پرچہ کراؤ،" ارشاد نے کہا، "کہتے ہیں ورنہ پُلس ڈاکٹر کی رپورٹ پر خُود کارروائی کرے گی۔ یہ ایسا کنون ہے ملک صاب کہ مُجھے بھی پکڑ کر باندھ دیں گے۔ پھر میرا سننے والا کون ہے؟ یہ سارا ٹنٹا اِس یُونین کے آدمی کا کھڑا کیا ہُوا ہے جی----"

یُونین کا نام سُن کر اعجاز چونکا۔ "کون آدمی ہے؟"

"اُس کا تو کسب ہی یہ ہے ملک صاب، غریبوں کو اُلٹی پلٹی راہ پر لگاتا ہے۔ اِس کا کیا جاتا ہے، مارے تو غریب جاتے ہیں۔"

"کیا کہتا ہے؟"

"کہتا ہے ہم اِکٹھ کر لیں تو مزدُوری دُگنی ہو جائے گی۔ پیشگیاں ماف ہو جائیں گی۔ کہتا ہے زیادتیوں کی رپورٹ کرو۔"

"تو کیا غلط کہتا ہے،" کنیز بولی۔ "پہلے تُجھے کیا اِنام مِل رہا ہے؟"

"اُس کا سَر پھرا ہُوا ہے جی،" ارشاد نے کہا، "اُس نے اِس بیواکوف کا بھی سَر پھیر دیا ہے۔"

"خیر، کوئی بات نہیں،" اعجاز بولا، "کوئی گناہ تو نہیں کرتا اگر ایسا کہتا ہے تو۔"

"کوئی سکوُل دکوُل کی بات نہیں جی،" ارشاد نے کہا، "میرے ساتھ جو حشر ہوا ہے اُسی کی وجہ سے ہوا ہے۔ ٹھیکیداروں کو خبر ہو گئی کہ یہ اِس آدمی کی بات سنتی ہے۔"